© rasailojaraid.com

Majallah e Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.75, 2009, pp 43 - 62

مجلّہ تحقیق
مجلہ کلیہ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، اپریل۔ جون ۲۰۰۹ء، شمارہ ۷۵

جنگ آزادی : پس منظر و پیش منظر

(کلام بہادر شاہ ظفرؔ کی روشنی میں)

ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری☆

Abstract:

War of Independence (1857) was a natural reaction by Indians against the ongoing dictatorship of East India Company. But unfortunately, they had to face defeat and alongwith their leader, the last Mughal king, Bahadur Shah Zafar, they fell a prey to the revenge of British. Zafar died in his exile. He was a sensitive poet. So his poetic message contains a very gloomy picture of pre and post war era which is a true reflection of British cruelty against the Indians and particularly Muslims. This poetry serves as an important documentary evidence in order to understand that era.

ہم آپ سب، اس شعور سے بہرہ مند ہیں کہ نعمتوں کی قدر محرومیوں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ اندھیرے کے بغیر اجالے، خوف کے بغیر امن، شر کے بغیر خیر اور غم کے بغیر خوشی کا تصور بے معنی سا لگتا ہے۔ آزادی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اس کا تصور بھی غلامی کے بغیر ادھورا ہے۔ دراصل آزادی ایک احساس کا نام ہے جو غلامی کے شعور سے پھوٹتا ہے یا یوں کہ لیجیے کہ آزادی کی گونج غلامی کے سناٹے سے جنم لیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے صبحِ صادق گھرے

☆ پروفیسر شعبہ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مہیب اندھیروں سے طلوع ہوتی ہے۔ اگر غلامی کی شدت محسوس نہ ہو تو آزادی کی لگن بھی پیدا نہیں ہوتی۔ آج ہم آزاد فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے اس احساس سے سرشار ہیں کہ سونا اگلتی اس دھرتی کے اوپر نیلے آکاش تک جو کچھ بھی ہے، ہمارا اپنا ہے۔ سمندروں کی گہرائیاں بھی ہماری اپنی ہیں اور فضاؤں کی پہنائیوں پر بھی ہماری اپنی ہی مہر ثبت ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ہمیں آزادی کی یہ نعمت یک بہ یک حاصل نہیں ہوگئی بلکہ اس کے حصول کی راہیں روشن کرنے کے لیے بزرگوں کی قربانیاں، اسلاف کا خون اور جذبہ و احساس کی بہت سی قندیلیں عہد بہ عہد سامان نور فراہم کرتی چلی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غلامی کے حصار میں رہتے ہوئے جب آزادی کا احساس جنم لے لیتا ہے تو وہ کسی مقام پر رک نہیں جاتا بلکہ رفتہ رفتہ خوشبو کی طرح پھیلنے لگتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ریگزاروں، کوہساروں، دریاؤں اور سمندروں سے آزادی کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ ایسے میں خاموشی دہکتی ہوئی تقریر اور سناٹا گونج کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ غلامی کے خلاف اٹھائی گئی یہی آواز، قید و بند کے خلاف کیا گیا یہی احتجاج اور آزادی کے حق میں بلند کی گئی یہی صدا شاعروں اور ادیبوں کے فکر وفن کو بھی جلا بخش دیتی ہے۔ ہماری ادبی تاریخ ایسے ادیبوں اور شاعروں سے بھری پڑی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ چراغ سے چراغ جلتا چلا گیا ہے۔ جہاں تک ہماری شعری روایت کا تعلق ہے، اس میں مذکورہ تسلسل کی اہم ترین کڑیوں میں پہلی قابل قدر کڑی مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار ابو المظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی، المعروف بہادر شاہ ظفرؔ ہی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنے موضوع کی مناسبت سے، ان کے اور ان کی شاعری کے بارے میں کچھ اظہار خیال کریں، چند باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی حدود کا تعین کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(الف) کلام ظفرؔ کے بارے میں شک اور رفع شک سے جڑی ہوئی ایک روایتی سی بحث وہ ہے جس کی بنیاد محمد حسین آزادؔ نے استاد پرستی کے جذبے سے مغلوب ہو کر اس طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی غلط بیانیوں سے رکھی:

''بادشاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلے کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں، کچھ کاظم حسین بیقرار کی ہیں۔غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتا پا حضرت مرحوم (ذوقؔ) کے ہیں... مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی ایک، کوئی آدھا مصرع، فقط بحر اور ردیف قافیہ معلوم ہو جاتا تھا، باقی بخیر۔ یہ ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۔''(۱)

گویا بقول عمر فیضی ''آزاد نے ظفرؔ کو نظر انداز کرنے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ اس غریب کا کلیات ہی ذوق کی جاگیر قرار دے دیا۔(۲) اور ظفرؔ کے لیے آزاد کی تیغ قلم کا یہ وار خواجہ تہور حسین کے الفاظ میں ''میجر ہڈسن کے وار سے کم مہلک نہیں'' تھا۔(۳) اس وار سے بچنا مشکل ہوتا، اگر شان الحق حقی (۴) اور ضیاء الدین برنی (۵) جیسے محققین اس کا توڑ نہ کرتے۔ انھوں نے بہت سی داخلی و خارجی شہادتوں کو بروے کار لاتے ہوئے نہایت ٹھوس اور مسکت دلائل سے آزاد کی غلط بیانیوں کی تکذیب و تردید کی اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ثابت کر دیا کہ ظفرؔ کے چاروں دیوان ان کی اپنی ہی معنوی اولاد ہیں۔ اب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے مگر اکثر ادبی مورخین و محققین مذکورہ روایتی بحث کی تکرار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن ہم یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ نہ تو ہماری مختصر سی تحریر میں اس بحث کی گنجائش ہے اور نہ ہم طے شدہ معاملات کی تکرار ضروری سمجھتے ہیں۔

(ب) ہماری دوسری وضاحت کا تعلق بھی کلام ظفرؔ ہی سے ہے لیکن یہ وہ کلام نہیں جو ان کے دواوین میں شامل ہے بلکہ قیدِ فرنگ کے آغاز سے قیدِ حیات کے انجام تک کے دور سے منسوب وہ اضافی کلام ہے جسے خلیل الرحمن اعظمی نے متفرق مجموعوں سے جمع کر کے ۱۹۵۷ء میں ''نوائے ظفرؔ'' کے نام سے شائع کردہ انتخاب کے آخر میں ''دکھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی پکار'' کے عنوان سے شامل کیا۔ اس جسے کلام کو ایک طرف تو شہرت و مقبولیت کی سند ملی اور دوسری طرف قیدِ فرنگ میں قرطاس و قلم جیسی سہولتوں کی عدم فراہمی کی بنیاد پر محققین و ناقدین نے اسے شک کی نظر سے دیکھا اور ظفرؔ کی تخلیق تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہوئے الحاقی کلام تصور کیا۔ حالانکہ یہ ظفرؔ ہی کے رنگ کا آئینہ دار اور انھی کے حسب حال تھا۔ ہر چند یہ کلام متنازعہ قرار پایا، تاہم یہ سوال اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے کہ ظفرؔ جیسا بسیار گو شاعر کم و بیش چار پانچ سال کا عرصہ خاموشی میں کیسے گزار سکتا تھا جبکہ کتھارسس کے لیے اس کے پاس شعر گوئی سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ اور پھر لندن ٹائمز (London Times) کے جنگی نامہ نگار ڈبلیو۔ایچ۔ رسل (W.H.Russell) کے اس بیان کو بھی کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے جس سے دیوارِ زنداں پر جلی ہوئی لکڑی سے ''چند عمدہ شعر'' لکھنے کی شہادت ملتی ہے۔ بہر حال اس متنازعہ کلام کے حوالے سے بھی ہمارے ہاں بحث کا خاصا طویل سلسلہ دکھائی دیتا ہے جسے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اجمالاً اپنی تاریخ ادب میں بیان کر دیا ہے۔(۶) ہمارا موقف اس ضمن میں یہ ہے کہ جب تک مستند تاریخی شواہد اور ٹھوس تحقیقی دلائل کی ناقابلِ تردید بنیاد پر اس کلام کو ظفرؔ کے بجائے کسی اور شاعر یا شاعروں کی ملکیت ثابت نہیں کر دیا جاتا، اس وقت تک اس امکان کو بھی ہرگز رد نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ظفرؔ ہی کی تخلیق ہے۔ فی الحال کوئی وجہ نہیں کہ اسے ظفرؔ کا کلام تسلیم نہ کیا جائے۔ چنانچہ ہم آئندہ سطور میں اس کلام کے حوالے اسی حیثیت سے درج کریں گے۔

(ج) اور آخر میں اس بات کا واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک مختصر مقالے میں عہدِ ظفر میں رونما ہونے والے سیاسی تغیرات اور ان کے اسباب و اثرات کے بارے میں مفصل معلومات کی فراہمی دریا کو کوزے میں بند کرنے سے کم مشکل نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لہٰذا ہم محض ضروری اشاروں پر ہی اکتفا کریں گے۔ اس حوالے سے جامع تفاصیل کے متمنی اہل علم نامور مؤرخین و محققین کی رقم کردہ ضخیم اردو تصانیف (۷) اور انگریزی کتب (۸) کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

اور اب ان وضاحتوں کے بعد آیئے دوبارہ اپنے موضوع کی طرف چلتے ہیں۔ ظفرؔ کی ولادت ۱۷۷۵ء میں لال قلعہ دہلی میں ہوئی۔ اس وقت ان کے داداشاہ عالم ثانی بادشاہ اور والد اکبر شاہ ثانی ولی عہد تھے۔ یہ وہ دور ہے جب مغلیہ سلطنت رو بہ زوال تھی۔ اس زوال کے متعدد اسباب تھے جن میں سے بعض کا تعلق ہندوستان کے اندرونی خلفشار سے ہے اور بعض اسباب بیرونی طاقتوں کی یورشوں سے متعلق ہیں۔ اندرونی خلفشار کا اندازہ محلاتی سازشوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی طوائف الملوکی سے لگایا جا سکتا ہے۔ آخری مضبوط مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر نے ۱۷۰۷ء میں وفات پائی اور بہادر شاہ ظفرؔ کی تخت نشینی ۱۸۳۷ء میں عمل میں آئی۔ ان دونوں واقعات کے مابین صرف ایک سوتیس سال کا فصل پایا جاتا ہے لیکن اس دوران میں آٹھ بادشاہ تخت نشینی کے ذائقے سے آشنا ہوئے۔ ان میں سے اکثر حکمرانوں کی کسالتوں، بے تدبیریوں، نااہلیوں اور عیاشیوں کے باعث جاٹوں، مرہٹوں اور روہیلوں کو سرکشی کرنے کے مواقع ملتے رہے۔ جب اپنے دم خم میں کمی آجائے تو بیرونی سہاروں کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ یہی کچھ مغلوں کے ساتھ ہوا۔ چنانچہ کبھی نجات دہندہ کے طور پر نادر شاہ درانی کو پکارا گیا (۱۷۳۹ء) اور کبھی احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی گئی (۱۷۶۱ء) کہ وہ ہندوستان میں وارد ہو کر سرکشوں کو کچل ڈالے۔ لیکن نتائج مطلوبہ مقاصد کے حصول سے کچھ زیادہ ہی متجاوز ہو گئے۔ عروس البلاد میں بے تحاشہ خون بہایا گیا، دولت سمیٹی گئی اور بالواسطہ طور پر سلطنت مغلیہ کی بنیادوں کو اور بھی کھوکھلا کر دیا گیا۔ میر تقی میرؔ کی شاعری اس المیے کے بیان سے خوں رنگ ہے۔ ظفرؔ کی شاعری میں بھی اس ضمن میں واضح اشارے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے مندرجہ ذیل شعروں کا انطباق یکساں طور سے مذکورہ حالات اور بعد کے واقعات، دونوں پر ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سکتا ہے:

نہیں حالِ دہلی سنانے کے قابل
یہ قصہ ہے رونے رلانے کے قابل

اجاڑے لٹیروں نے وہ قصر اس کے
جو تھے دیکھنے اور دکھانے کے قابل

نہ گھر ہے نہ در ہے رہا اک ظفؔر ہے
فقط حالِ دہلی سنانے کے قابل

مذکورہ حالات میں سب سے زیادہ فائدہ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اٹھایا۔ اس کمپنی کے توسط سے انھوں نے تجارت کے پردے میں ملکی سیاست میں دخیل ہو کر حکومت کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیے۔ اسے ان کی سیاسی حکمت عملی اور تدبر کہیے یا شاطری اور چالبازی کا نام دیجیے کہ معرکہ کوئی بھی ہو، اثر و نفوذ انھی کا بڑھ جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی ہو یا ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر، دونوں کے نتائج انھی کے حق میں ظاہر ہوئے اور رفتہ رفتہ انھیں بنگال، اودھ اور بعض دیگر علاقوں میں غلبہ حاصل ہو گیا۔ ۱۷۹۹ء میں میسور کی جنگ کے نتیجے میں انھوں نے دکن کی سب سے توانا آواز کو بھی خاموش کر دیا اور جنوبی ہند میں بھی اپنی فتوحات بڑھانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب حالات انھیں مرکز پر گرفت قائم کرنے کی طرف لے جا رہے تھے۔

بکسر کی لڑائی (۱۷۶۴ء) کے بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ظفؔر کے دادا شاہ عالم ثانی بنگال، بہار اور اڑیسہ وغیرہ کی دیوانی کے حقوق انگریزوں کو دینے پر مجبور ہو گئے جنھوں نے انھیں بعد ازاں ایک معاہدے کے تحت مطلق العنان حکمران کے بجائے زرِ پیشکش (پنشن) کا محتاج یعنی پنشنر یا وظیفہ خوار اور برائے نام بادشاہ بنا کر رکھ دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک بھی سلطنت مغلیہ خاصی وسیع تھی اور دو آب، ستلج سے اس پار اور آگرہ تک کا احاطہ کرتی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب روہیلوں نے اپنی منتشر قوت کو مجتمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ چند ہی برسوں کے بعد وہ شاہ عالم ثانی پر غالب آ گئے اور ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ نے انھیں اندھا کر دیا اور خوب لوٹ کھسوٹ مچائی۔ میر کا، ضرب المثل کا درجہ اختیار کر جانے والا یہ شعر اسی دردناک واقعے کی فکر انگیز تصویر پیش کرتا ہے:

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

یہ اہم واقعہ ظفرؔ کی زندگی کا پہلا بڑا المیہ تھا جو انھوں نے صرف تیرہ سال کی عمر میں دیکھا۔ اس کے بعد اٹھارویں صدی عیسوی کے آخری چند برسوں میں مغلوں کی عسکری کمزوریاں کھل کر سامنے آ گئیں اور بزورِ شمشیر مرہٹوں وغیرہ نے حکومت کو بے بس کر کے رکھ دیا۔ ۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج نے لارڈ لیک کی قیادت میں دہلی پر قبضہ کر لیا اور شاہ عالم ثانی کو مرہٹوں کی قید نما سرپرستی سے نجات دلائی مگر اب ان کے ہاتھ سے طاقت جا چکی تھی اور ان کے اختیارات لال قلعہ تک محدود ہو گئے تھے۔ دلی جو، ان کی راجدھانی تھی، جلد ہی ریذیڈنسی کا روپ دھار گئی جس کا نظام انگریز ریذیڈنٹ چلانے لگا۔

۱۸۰۷ء میں شاہ عالم ثانی کی وفات کے بعد ظفرؔ کے والد اکبر شاہ ثانی اس تاج و تخت کے وارث ٹھہرے جو ایک طرح سے بے حقیقت تھا۔ وہ اپنے پیش رو سے بھی کمتر اختیارات کے مالک تھے اور ان کی حیثیت بھی پنشنر یا ایک وظیفہ خوار بادشاہ کی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفرؔ تخت نشین ہوئے۔ اس وقت تک سلطنت مغلیہ پر انگریزوں کی گرفت اور بھی مضبوط ہو چکی تھی۔ بادشاہ کے اختیارات ہی کم سے کمتر نہیں ہوتے چلے گئے تھے بلکہ زرِ پیشکش (پنشن) بھی گھٹتے گھٹتے ایک تہائی ہو کر رہ گیا تھا۔ نام تو بادشاہ کا ہوتا مگر حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا۔ چنانچہ عملاً ظفرؔ کے اختیارات دلی کے ریذیڈنٹ سے بھی کم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے۔ مغلیہ سلطنت اپنے منطقی انجام کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اور ظفؔر اپنے کئی پیش روؤں کی نالاں اور اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا جھیل رہے تھے۔ ایک طرف تو ان کی ذاتی انا کو بے بسی کا کرب لاحق تھا اور دوسری طرف اجتماعی انا کی شکست و ریخت کا المناک عمل جاری تھا۔ سلطنت کی توڑ پھوڑ اپنی جگہ، مغلوں کی پروان چڑھائی ہوئی تہذیبی روایات بھی صدمے جھیل رہی تھیں۔ ظفؔر کو ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے کچھ زیادہ ہی کچوکے لگتے ہوں گے۔ انھیں لال قلعہ میں میسر ظاہری چمک دمک فریب نظر (Illusion) سے زیادہ تو محسوس نہ ہوتی ہوگی۔ اسی لیے تو وہ قدرت کے دیے ہوئے دوہرے کردار (Dual Character) سے اکتاہٹ کا اظہار کرنے لگتے ہیں جس میں شکوہ سنجی اور گلہ مندی کا انداز در آتا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں:

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوریِ ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفؔر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

مذکورہ عہد میں ہندوستان کے عوام و خواص بھی بے بسی اور شکستگی کے کچھ ایسے ہی احساس سے دو چار تھے۔ وطن ان کا، بادشاہ ان کا، ریاستوں کے راجے مہاراجے اور نواب ان کے، مگر غلبہ و تسلط بدیشی حکمرانوں کا۔ گویا آزاد فضاؤں میں سانس لینے کے عادی ہندوستانی باشندوں کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال کر انھیں آزادی اور احساسِ آزادی سے زندگی گزارنے کے بنیادی انسانی حق سے محروم کیا جا رہا ہو۔ وہ رفتہ رفتہ خود مختار ملک کے آزاد شہری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا درجہ کھو کر مغلوب ملک کی غلام رعیت بن کر رہ گئے تھے۔ اس صورت حال کا رد عمل یقینی تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ جنگ اس بات کا کھلم کھلا اعلان تھی کہ ہندوستانی باشندے انگریز حکمرانوں، ان کے اقتدار اور ان کی ظالمانہ پالیسیوں کو کسی قیمت پر بھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ بدقسمتی سے اس جنگ میں انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا جس کی بنا پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے انقلاب کی اس کوشش کو بغاوت پر محمول کیا۔ اس جرم کی پاداش میں جہاں اور بہت کچھ ہوا، وہاں بدیشی حکمرانوں نے ملک کے بادشاہ ظفرؔ کو گرفتار کر لیا اور رنگون جلا وطن کر دیا۔ وہیں ۱۸۶۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ گویا بادِ مخالف نے ''چراغِ دہلی'' کو دہلی سے بہت دور غربت میں بجھا دیا۔(۹) ظفرؔ کی اس غزل کے اشعار، خصوصاً مقطع کس قدر الہامی معلوم ہوتا ہے:

لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

بلبل کو پاسباں سے نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید تھی لکھی فصلِ بہار میں

کہہ دو یہ حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

اک شاخِ گل پہ بیٹھ کے بلبل ہے شادماں
کانٹے بچھا دیے ہیں دل لالہ زار میں

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہو گئی
پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کنج مزار میں

کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

خستگی، اداسی، بے کسی اور بدنصیبی کی یہ حزنیہ لے ظفر کی شاعری میں سرایت کی ہوئی ہے۔ ان کی شاعری ان کے ذاتی کرب اور عصری آشوب کی آئینہ دار اور درد و سوز سے معمور ہے۔ اس ضمن میں یہ غزل تو آپ ہی اپنا جواب ہے:

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں، جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

مرا رنگ روپ بگڑ گیا، مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں

میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

حزن و ملال اور سوز و گداز کی ان پر تاثیر کیفیتوں کا سر چشمہ ان ذاتی و اجتماعی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حالات ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے جن سے ظفر ساری زندگی دو چار رہے۔ اور یہ زندگی کسی عام آدمی کی زندگی نہیں، ایک عظیم الشان سلطنت کے اس وارث کی زندگی ہے جس نے شکست و ریخت کا عمل بڑی تیز رفتاری سے رونما ہوتے ہوئے دیکھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اسے دو بڑے حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ سطور گذشتہ میں ہم نے دونوں ادوار کے حوالے سے اجمالی اشارے کیے ہیں۔ یہ اجمال جنگ آزادی کے حوالے سے کسی قدر تفصیل کا متقاضی ہے تاکہ ظفر کی شخصیت کا وہ رخ سامنے آسکے جسے بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

ظفر کی شخصیت اپنے اکثر پیش رووں سے مختلف تھی۔ ان کی تخت نشینی اور جنگ آزادی کے بیچ صرف بیس سال کا فصل حائل ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے لیے انگریزوں کے لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہوئے اقتدار کے ساتھ تا دیر نباہ کرنا اور اپنی قوم کو غلامی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھنا ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ کئی شواہد اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ وہ جلد سے جلد انگریز کی حاکمیت سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر خدا نے انھیں ایسی کرداری خصوصیات اور شخصی اوصاف عطا کر رکھے تھے کہ اس گئے گزرے اور سیاسی انحطاط کے دور میں بھی عوام و خواص کے دلوں میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ لوگ انھی کو اپنا حاکم جانتے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ نہ صرف عوام ان کا احترام کرتے تھے بلکہ مختلف ریاستوں کے نواب یا راجے مہاراجے بھی ان کی سرپرستی میں تاج پوشی اور تخت نشینی جیسے مرحلے طے کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ بدیشی حکمرانوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جب اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کا سوال اٹھایا گیا تو رانی لکشمی بائی، نانا فرنویس، تاتیا ٹوپے اور نواب واجد علی شاہ جیسی مختلف الخیال شخصیتوں نے ان کی قیادت پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے تن من دھن سے اس کارِ خیر میں شامل ہونے کا عزم کیا اور جنگ آزادی کے لیے مشترکہ حکمت عملی وضع کی۔ اسی طرح جدید عسکری تقاضوں سے نا آشنا فوج کے اندر پیشہ ورانہ باقاعدگی لانے کی کوشش اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں شامل ہندوستانی سپاہیوں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انگریزوں کے خلاف بغاوت جیسے امور کے پیچھے بھی براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ظفؔر کی شخصیت کارفرما نظر آتی ہے۔ ان کے دل میں آزادی کی جو لگن تھی، یہ بھی اسی کا ایک ثبوت ہے کہ انھوں نے دوران جنگ، روہیلوں کے ساتھ اپنی خاندانی دشمنی کو بھلا کر بخت خان روہیلہ کو سپہ سالار مقرر کر دیا۔ لیکن یہ کوششیں کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکیں۔ بہر حال تاریخ یہ بات کبھی فراموش نہ کر سکے گی کہ ظفؔر نے بیاسی سال کی عمر میں بھی جنگ آزادی کی قیادت کی۔

جنگ آزادی کی ناکامی کے اپنوں کی غداری سمیت جہاں اور بہت سے اسباب ہیں ان میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ بعض جوشیلے آزادی پسند عمائدین نے اس کا آغاز وقت معین سے پہلے ہی کر دیا۔ اس بدنظمی کے باعث منتشر قوت کو مجتمع ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ گویا نادان دوستوں نے دشمن کو حاوی ہونے کا راستہ فراہم کر دیا۔ شروع شروع میں تو بعض علاقوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مغلوب ہونے کی خبریں بھی آئیں اور ہندوستانی سپاہیوں نے ظفؔر کی اجازت کے بغیر اور خواہش کے برعکس انتقامی جذبات کے تحت عام انگریزوں کو، جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، قتل کیا۔ غالب آنے کی اطلاعات پا کر ظفؔر نے دوران جنگ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ جاری معاہدے کو توڑنے اور خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے انگریزوں کو ہندوستان سے نکل جانے کا حکم بھی دے دیا مگر جلد ہی ہوا پلٹ گئی اور مختلف علاقوں سے ہوتی ہوئی شکست مرکز تک آ پہنچی۔ ظفؔر کو شہزادوں کے کٹے ہوئے سروں کا ''تحفہ'' بھیج کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں نے اپنی شقاوت قلبی کا مظاہرہ کیا اور انھیں اپنے قریبی اعزہ سمیت گرفتار کر لیا۔ ان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف بغاوت کرنے اور متعدد انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کی فرد جرم عاید کی گئی اور فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ ظفؔر جس لال قلعے میں تخت پر بیٹھا کرتے تھے، وہیں انھیں مجرم کے طور پر پیش کیا گیا۔ انھیں معافی مانگنے پر سزا نہ دینے کی پیش کش بھی کی گئی مگر انھوں نے ایسا نہ کیا اور حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ۱۸۵۸ء میں انھیں عمر قید کی سزا سناتے ہوئے رنگوں جلا وطن کر دیا گیا جہاں انھوں نے زندگی کے بقیہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چار سال گزار کر ۱۸۶۲ء میں ستاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ انھیں وطن پرستی کی اتنی بڑی سزا دی گئی کہ دلی میں تدفین کی خواہش کو بھی پورا نہ کیا گیا۔ سلیم الدین قریشی اس پوری صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''۱۸۵۷ء میں جب عوام نے غیر ملکی تسلط کے خلاف تحریک آزادی کا علم بلند کیا تو اپنے پڑ دادا اورنگزیب عالمگیر کی طرح بہادر شاہ ظفؔر نے پیرانہ سالی میں جنگ آزادی کی قیادت سنبھالی۔ لیکن مغل شاہزادوں اور عسکریوں کی تربیت میں سالہا سال تک جنگی تربیت کی عدم موجودگی، تحریک آزادی کے عمایدین کی آپس میں نا اتفاقی اور خود جنگی مجلس کے اراکین کی انگریزوں سے ساز باز اور کچھ دوسری وجوہات کی بنا پر یہ جنگ کامیاب نہ ہوسکی اور ظفؔر اور اس کے خاندان کو اس کی ناکامی پر جان و مال کی عظیم ترین قربانی دینا پڑی۔'' (۱۰)

اس عہد کی جو روح فرسا تصویریں خواجہ حسن نظامی کے بعض مضامین اور غالبؔ کے بعض خطوط میں دکھائی دیتی ہیں، ان سے شاہی خاندان کی تذلیل اور کس مپرسی کا کربناک منظر سامنے آتا ہے۔ یہاں طوالت سے بچنے کے لیے مثالیں درج کرنے سے گریز کیا جارہا ہے۔ عوام الناس کی حالت تو اور بھی پتلی تھی۔ ظفؔر کی بہت سی غزلیں اجتماعی زندگی کے المناک مناظر پیش کرتی ہیں مثال کے طور پر یہ غزل دیکھیے:

گئی یک بہ یک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے

یہ رعایا ہند تبہ، ہوئی کہوں کیا جو ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

یہی تنگ حال جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرت رب کا ہے
جو بہار تھی سو خزاں ہوئی جو خزاں تھی اب وہ بہار ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گنہ،
وہ لے کلمہ گو بولیں کس سمت سے ابھی دل میں ان کے بخار ہے

شب و روز پھول میں جو تلے ، کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوق قید میں جب انھیں، کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے

نہ تھا شہر دہلی یہ تھا چمن کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے

سہیں جا وہ اتمام سخت ہے ، کہو کیسی گردش وقت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے

یہ غزل تکنیکی لحاظ سے کچھ زیادہ پر کشش نہیں تاہم حالات کی عکاسی ضرور کرتی ہے۔
ایسی ہی ایک اور غزل ملاحظہ کیجیے:

کیا خزاں آئی چمن میں ہر شجر جاتا رہا
چین اور میرے جگر کا بھی صبر جاتا رہا

کیوں نہ تڑپے وہ ہما اب دام میں صیاد کے
بیٹھنا وہ دو پہر اب تخت پر جاتا رہا

شام کو غنچہ کھلا تھا چوک کے بازار میں
اب وہاں پر یا خدا لاکھوں کا سر جاتا رہا

رہتے تھے اس شہر میں شمس و قمر حور و پری
لوٹ کر ان کو کوئی لے کر کدھر جاتا رہا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اب اسی قافیے میں ایک اور غزل دیکھیے۔ اس میں اجتماعی المیے کے بہت سے پہلو بہتر فنی پیرائے میں بیان ہوئے ہیں اور ماضی اور حال کے استعاراتی تقابل سے معنویت دو چند ہوگئی ہے:

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے
شغال اب ہیں جہاں بستے، کبھی بستے بشر یاں تھے

جہاں چٹیل ہے میداں اور سراسر ایک خارستاں
کبھی یاں قصر و ایواں تھے چمن تھے اور شجر یاں تھے

جہاں پھرتے بگولے ہیں اڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اڑتی تھی دولت ، رقص کرتے سیم بر یاں تھے

جہاں ہیں سنگ ریزے، تھے یہاں یاقوت کے تودے
جہاں کنکر پڑے ہیں اب ، کبھی رلتے گہر یاں تھے

جہاں سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشاں
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں اور شور و شر یاں تھے

جہاں اب خاک پر ہیں نقشِ پائے آہوے صحرا
کبھی محوِ تماشا دیدۂ اہلِ نظر یاں تھے

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیسا کہ اس غزل سے بھی ظاہر ہے، غزل کی شاعری علائم و رموز کی شاعری ہے۔ براہِ راست اظہار کے بجائے رمز و ایما کے پردے میں اظہار سے غزل کی معنویت میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ ظفرؔ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ وہ بنیادی طور پر غزل ہی کے شاعر تھے۔ اس ضمن میں ان کا تخصص یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے دیے ہوئے ذاتی کرب اور عصری آشوب کے حوالے سے بعض روایتی استعاروں اور علامتوں کو خاص مفاہیم عطا کیے۔ ان علامتوں میں قید و قفس سے جڑی ہوئی علامتیں بطور خاص دیکھی جا سکتی ہیں۔ اکثر ناقدین فن مثلاً خلیل الرحمٰن اعظمی نے ظفرؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ایسی علامتوں اور استعاروں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ ظفرؔ کے بعد تو آج تک مختلف ادوار میں ان علامتوں اور استعاروں کو اکثر شعراء نے سیاسی پس منظر میں ہی استعمال کیا ہے۔ یہاں ظفرؔ کے چند اشعار دیکھیے:

نہ تنگ کیوں ہمیں صیاد یوں قفس میں کرے
خدا کسی کو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے

☆

نہیں ہے طاقتِ پرواز آہ اے صیاد
خدا کرے کہ تو اب وا درِ قفس نہ کرے

☆

اب کہاں ہے طاقتِ پرواز تا بامِ قفس
کر دیا صیاد نے بے بال و پر میرے تئیں

☆

خوب پھڑکا لے مجھے کنجِ قفس میں صیاد
شوق پرواز سے بے بال و پری نے مارا

☆

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تا باغ ہم نہ پہنچے قفس ہی میں مر گئے
کہہ کر کہ ہائے ہائے چمن ہائے باغ باغ

☆

اے ظفرؔ یوں ہیں اسیرانِ قفس حیرت میں
ہووے جس طرح سے دیوارِ گلستاں پہ نقش

☆

اے صبا ہوں بلبلِ تصویر مجھ کو کیا خبر
کب بہار آئے ہے گلشن میں خزاں کب جائے ہے

☆

برنگِ طائر تصویر ہوں میں دامِ حیرت میں
رہائی کی مری کوئی جو صورت ہو تو کیونکر ہو

☆

کوئی دیوانہ کیا پھر سلسلہ جنبانِ وحشت ہے
سبب کیا ہے الٰہی خانۂ زنجیر میں غل کا

☆

توڑ زنجیر کو دیوانہ نہ بھاگا ہو کہیں
دیکھیو غل ہے پڑا خانۂ زندان میں کیا

ان اشعار میں استعمال ہونے والی صیاد، طائر، قفس، باغ، گلستان، زنجیر اور زنداں وغیرہ کی علامتیں گذشتہ صفحات میں بیان کردہ حالات و واقعات کی روشنی میں بآسانی سمجھی جا سکتی ہیں۔ کہیں کہیں تو صیاد کے ظلم کی داستاں بالکل کھول کر بیان کر دی گئی ہے۔ جیسے ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اشعار میں:

جن گلین میں پہلے دیکھیں لوگن کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو ان لوگاں بن سونی پڑی وہ گلیاں تھیں
خاک کا ان کا بستر ہے اور سر کے نیچے پتھر ہے
ہائے وہ شکلیں پیاری پیاری کس کس چاؤ سے پلیاں تھیں
ان کی شکلیں خاک و خوں میں آہ ملیاں دیکھیاں
گرتت محلوں میں جنہوں نے گرتت رلیاں کھیلیاں

یہ اور اس طرح کے اور بہت سے اشعار، ظفؔر کے ذاتی و عصری آشوب کی بہت واضح عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں انگریزوں کے ظلم و ستم اور برطانوی استعمار کی چیرہ دستیوں کے وہی نقش دکھائی دیتے ہیں، جن سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ لیکن وہ جو فیض نے کہا ہے کہ "ظلم کی میعاد کے دن" تھوڑے ہی ہوا کرتے ہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی بالآخر ہندوستان سے اپنا بوریا بستر گول کر کے جانا ہی پڑا اور آزادی کی جو جنگ بہادر شاہ ظفؔر نے شروع کی تھی، ظاہری ناکامی کے باوجود بھی جاری رہی اور غلامی کے مہیب اندھیروں سے آزادی کا سورج طلوع ہو کر رہا۔

☆☆☆

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حواشی

۱۔ آبِ حیات ۲۰۰۶ء ملتان: بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ص۳۲۵

۲۔ کلیاتِ ظفر ۱۹۹۴ء لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، جلد اول، ص۳۲۷

۳۔ بہادر شاہ ظفر ۱۹۶۵ء فن اور شخصیت۔ کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ص۲۹

۴۔ انتخاب ذوق وظفر ۱۹۴۵ء دہلی: انجمن ترقی اردو

۵۔ ''ظفر کی شاعری'' جنوری ۱۹۵۴ء مشمولہ رسالہ اردو۔ انجمن ترقی اردو کراچی

۶۔ اردو ادب کی تاریخ ۲۰۰۳ء لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۷۷ تا ص۸۱

۷۔ مثلاً دیکھیے: ۱۹۹۷ء (i) اسلم پرویز۔ بہادر شاہ ظفر۔ لاہور: مکتبۂ عالیہ

(ii) ضیاء الدین لاہوری ۱۹۹۹ء۔ بہادر شاہ ظفر کے شب و روز۔ لاہور: مطبوعات

(iii) ڈاکٹر سردار احمد خان ۲۰۰۱ء۔ بہادر شاہ ظفر۔ شخصیت، فکر اور فن۔ کراچی: علمی ورثہ

(iv) ناصر کاظمی و انتظار حسین ۱۹۵۷ء۔ مرتبین؛ سن ستاون۔ لاہور: آئینۂ ادب

8- Sea: (i) Datta, Kalikankar. 1965 Shah Alam and the east India Company. Culcutta: The world Press

(ii) Panikar, K.N.1968 British Diplomacy in North India.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Delhi: Associated Publishing House

(iii) Fisher, Micheal H.1991 Indirect Rule in India1764-1858: Delhi: Oxford University Press

(iv) Burke, S.M and Quraishi, Salim al din.1995 Bahadur Shah: The Last Mogul Emperor of India. Lahore: Sang-e-Meel Publications

۹۔ یاد رہے ''چراغ دہلی'' سے ظفر کی تخت نشینی کا سنہ ہجری ۱۲۵۳ برآمد ہوتا ہے۔

۱۰۔ سلیم الدین قریشی ۱۹۹۴ء مرتب؛ بیاض ظفر۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۲۱

© rasailojaraid.com